ڈاکٹر سعادت سعید
جی سی یونیورسٹی، لاہور

سر سید احمد خان کی علمی عطا اور ہمارا عصری شعور

In very era the genius people are present which provide the base of educational structure for any nation. Through studying such people, we can predict that what will be the vision of the educated people in the future. Sir Syed Ahmed Khan is one of those genius people who showed the path of success to the deprived Muslims. He wanted the Muslims to gain their political prestige on their own. For the provision of this objective it was important that they knew about the modern knowledge. It is on this basic he wanted Muslims to prosper in science, politics and technical field to be beneficial for the Muslim of the subcontinent. So, in this way Sir Syed provided a platform for the Muslim's prosperity which was made by Iqbal and Jinnah, an ideal for themselves for the self-respect of Muslims.

اس حقیقت کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے پر یہ ٹھوس شواہد رکھتی ہے کہ مذہبی بنیادوں پر ہندوستان میں فسادات اور قتل و غارتگری کا سلسلہ کم از کم آریائوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد سے جاری و ساری رہا ہے۔مقتدر قوتوں نے اپنی سازشوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مذہبی ہتھیاروں سے متعدد بار بھرپور کام لیے ہیں۔جنگ آزادی میں بظاہر ہند و اور مسلمان مل کر انگریزوں کے خلاف لڑے۔لیکن ان کے اندرونی تعصبات کا یہ حال ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ۱۹۸۳ء میں اٹاری سٹیشن پر ہندو پانی اور مسلمان پانی کے علیحدہ علیحدہ بورڈ دیکھے ہیں۔سو مذہبی تعصبات اور منافرتوں نے ہندوستان کے لوگوں کے اتفاق کو ہر زمانے میں پارہ پارہ کیا۔یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ایسے میں مسلمان ماسٹر رام چندر کی علمی و سائنسی خدمات کو کیوں تسلیم کریں اور ہندو سر سید احمد خان کو اپنا رہنما کیوں بنائیں۔البتہ دکھاوے کے لیے کانگرسی بڑے بڑے مسلمانوں کی راہنمائی کے حوالے دے سکتے ہیں لیکن جب نفرتیں کورئوں اور پانڈوئوں یعنی بھائیوں کے درمیان جنگیں کروا سکتی ہیں تو نئے زمانے میں

بھی ہندو اور مسلمان باہمی آویزش کی حالت میں کیوں نہیں رہیں گے۔ایک خاندان کا ایک آدمی ہندو ہوا ایک مسلمان اور ایک سکھ مگر ان بھائی بندوئوں کے مابین مذہبی اور سماجی تعصبات کے سلاسل کو مہاتما گاندھی سمیت کوئی رہنما نہ روک سکا۔

سر سید احمد خان کی ابتدائی قومی خدمات میں یہ گنجائش موجود تھی کہ انہیں ہندوستانی قوم کا قائد سمجھا جاتا مگر ہندوئوں اور مسلمانوں کے باہمی مذہبی، سماجی اور ثقافتی تفرقوں کی وجہ سے وہ صرف مسلمانوں کے قائد کہلائے۔ہندوستانی قوم کی اصلاح کے لیے قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال نے بھی بڑا زور لگایا لیکن مذکورہ تعصبات کی نسبت سے انہیں مسلمانوں کا رہنما قرار دے دیا گیا۔اور یہ قائدین سر سید سمیت ہندوستان کی دھرتی کے باسیوں کو بھگتوں والی شکتی اور شانتی مہیا نہ کر سکے کہ دھرتی کے باسیوں کی پریت میں نفرتوں کے زہر گھلے تھے

علم عمل کے بطن سے نمودار ہوتا ہے۔تاریخ انسانی کے متعدد مجردات کسی نہ کسی ٹھوس صورت کی بنیاد پر وضع ہوئے ہیں۔یہ مجردات انسان کی بے بسیوں کی کہانیاں بھی سناتے ہیں اور اس کی ناپائیدار زندگی کا فسانہ بھی بنتے ہیں۔مزید برآں ضرورت ایجاد کی ماں ہے کا قصہ بھی نامانوس قصہ نہیں ہے۔انسانی تمدن ٹھوس اور اس کی بنیاد پر وجود پذیر ہونے والے مجرد کے درمیان سفر کرتا ارتقائی صورت میں سامنے آیا ہے اور آ رہا ہے۔اسے جدلیاتی مظہریات کہہ لیں یا ضروریاتی ایجادگی ، انسان نے آگے بڑھنے کے لا تعداد راستے ڈھونڈے ہیں لیکن اس کی انفرادی ناپائیداری نے اس عمل کو اجتماعی انسانی عمل کا حصہ یوں بنایا ہے کہ ہر پیدا ہوتے بچے کو سابقہ نسلوں سے کچھ زیادہ ہی میسر آیا ہے۔

انسانی ضروریاتی اور احتمالی یا امکانی فکر نے علم کے لاتعداد دروازے کھول رکھے ہیں۔اس لیے پرانے اور نئے کا جھگڑا ایک لازمی جھگڑے کی صورت مادی تاریخ کے ہر دور کا خاصہ رہا ہے۔اس لیے اس نوع کا دعویٰ کرنا کہ ہم علم کی تاریخ کے حتمی مرحلے میں ہیں کار عبث و بیکار ہے کہ یہ سلسلہ نئی ضرورتوں سے منسلک نئی ایجادات اور نئی فکری مجردات کے سلاسل پیدا کرتا چلا جا رہا ہے۔چونکہ انسان کائنات میں ایک بے حیثیت وجود کی صورت ہے وہ اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے علمی وسائنسی میدانوں میں منزلوں پہ منزلیں مارتا چلا جا رہا ہے۔لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہماری زمین اور اس پر موجود زندگی تیزی سے گردش کرتے کروں کے درمیان ہمہ وقت تباہی اور بربادی کے دہانوں پر

ہیں۔کئی بلیک ہولز یا اندھے کنویں یا ٹکراتی کہکشائیں ہمارے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر سکتی ہیں۔اسے مذہبی اصطلاحوں میں قیامت کہیں یا زمینی سیارے کا خاتمہ بالخیر ایک مستقل خطرہ ہے جو مجموعی انسانیت کے سر پر منڈلا رہا ہے۔

موت نے کر دیا لاچار وگرنہ انساں ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا[۱]

یوں موت اور فنا کے خطرات سے لاچار انسان کسی ایسی ہستی کے گرویدہ ہو جاتے ہیں جو ان کے ٹھوس حالات میں سے کسی مجرد کی صورت ابھر کر ان کی تشفی و تسلی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔دنیا بھر کے قدیم مذاہب میں دیوی دیوتائوں یا ہستی بر تر کا تصور ایسی ہی نفسیات کی بدولت سامنے آیا ہے۔بقول الف۔د۔نسیم:

"اس قسم کے خیال کا اظہار شوپنہارنے بھی اپنے ایک مقالہ بہ عنوان "انسان کو مابعدالطبیعیات کی ضرورت" میں کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ مذہب اور فلسفہ کے آغاز کا سراغ موت کی حقیقت میں مل سکتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر انسان کو حیات جاوید میسر آتی تو شاید مذہب کا وجود نہ ہوتا۔ہمیں اس خیال سے اتفاق کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ موت کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ایسی ہیں جو مذہب کے اجرا اور اثبات کا باعث بنی ہیں۔ان میں مظاہر قدرت کے غیظ و غضب سے اپنے آپ کو، اپنے گھر بار اور کھیتوں کو محفوظ رکھنے کا خیال اور زندگی کو کامیاب سے کامیاب تر بنانے کے لئے ایسے سہاروں کی ضرورت جو بظاہر میسر نہیں آ سکتے تھے، خاص طور پر شامل ہیں۔چنانچہ جب ہم قدیم سے قدیم تر وحشی انسان کے مذہبی خیالات کا کھوج لگاتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ اپنے سے کسی بہتر ہستی کا تصور اس وقت قائم کرنا شروع کرتا ہے جب وہ اپنی تمام مدافعتی قوتوں خصوصاً جادو اور سحر کو مظاہر فطرت کے آگے بے بس پاتا ہے اور اپنے ان ہتھیاروں سے ان پر غلبہ نہ پا سکنے کے بعد ان سے مفاہمت کی کوشش کرتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا تھا جب وہ ان کے سامنے اپنے عجز کا اقرار کرتا۔چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور آندھی ، طوفان، بیماری، خوف اور موت سے بچنے یا ان کو ٹالنے کے لئے اور اپنی خوش حالی ، ترقی اور کامیابی کی امید میں ان تمام مظاہر فطرت کے آگے سر جھکانا شروع کر دیا جو یا تو ان کو کسی نہ کسی طرح کا مادی فائدہ پہنچاتے تھے یا نقصان۔دونوں حالتوں میں اسے ان کی خوشامد کی ضرورت تھی اور اس نے انہیں دیوتا اور خدا بنا کر پوجنا شروع کر

دیا۔ یہ تھی کسی ہستی برتر کے تصور کی ابتدا جہاں سے مذہب کا آغاز ہوا اور پھر جہاں سے خدا کی موجودگی کا خیال اور یقین ابھرا۔ اس سے پتہ چلا کہ مذہب کا منبع یاس اور خوف ہے۔ خواہ وہ موت کا خوف ہو یا کسی شئے کا۔۔۔۔ اس لحاظ سے ہم الفریڈ ویبر (Alfred Weber) کی اس تعریف کو کسی حد تک جامع کہہ سکتے ہیں:

> " مذہب ذہنی نقطہ نظر سے ایک خوف ہے جو موت و حیات کے مالک (خواہ وہ حقیقی ہوں یا خیالی) ہم میں پیدا کرتے ہیں اور خارجی لحاظ سے یہ ان تصورات اور رسوم و مسائل کے مجموعہ کا نام ہے جو اس خوف کا نتیجہ ہیں۔"(۲)

تاریخی مادیت یا مادی تاریخیت کے ماننے والے اس بات سے پورے طور پر متفق ہیں کہ عمل وعلم کے ابطان سے بر آمد ہونے والے مذہبی، فکری اور سماجی رشتوں کے کئی کلی نظام انسانی ارتقا کی تاریخ کے لازمی اجزا ہیں۔ ان اجزا پر کئی قاموسی جلدیں کتب خانوں کی زینت بنی ہیں جن میں قدیم و جدید کے نزاعات راسخ ہیں۔ اکیسویں صدی میں موجود لا مذہبیت ، مذہبیت اور فکریات کے سارے سلاسل معلوم انسانی تاریخ میں حسب حال موجود رہے ہیں۔ اس لیے اس نوع کے مغالطوں سے گریز کا امکان ہے کہ:

(ا)علم صرف عہد جدید کی میراث ہے(۲) مذہب قصہ قدیم ہے(۳) صرف عصر حاضر کاانسان مہذب ہے۔ آغا شوکت علی کاخیال ہے کہ مسلم دنیا عظیم علمی خزانوں کی حامل ہے۔ مسلم دانشوروں نے فلسفہ، منطق ،ہیت ،طب، ادب، طبیعیات اور دیگر کئی شعبوں‌خدمات سر انجام دی ہیں۔ ہماری توجہ ان خدمات پر مرکوز ہونی چاہیے :

"جن کی بدولت فکر و شعور کی رنگا رنگ لہروں نے انسانیت کو سیراب کیا ہے۔(تا کہ) ہمارے مذہبی اذہان جدید علوم سے بہرہ ور ہوں اور جدید طبقہ اپنی ثقافتی اور تہذیبی روایات کا شعور حاصل کرے۔۔۔۔ عہد حاضر میں اپنی جڑوں کی جانب لوٹنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اسلامی نشاۃ الثانیہ کا رستہ ہموار کر سکیں۔ عظیم مسلم قائد امام خمینی نے گوربا چوف کے نام اپنے ایک خط میں مسلم ماضی کی جن عظیم شخصیتوں کا تذکرہ کیا تھا ان میں ابن عربی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں"اگر

انسان سارے جہاں کو مسخر کر لے اور اس سے کہا جائے کہ ایک اور دنیا بھی ہے تو فطری طور پر وہ چاہے گا کہ اس دوسری دنیا کو بھی اپنے زیر نگیں کرے۔ انسان خواہ جتنا بھی عالم ہو اگر اس سے کہا جائے کہ دنیا میں اور بھی علوم ہیں قدرتی طور پر وہ چاہے گا کہ وہ ان علوم کو بھی سیکھے۔ اس لئے اقتدار کامل اور دانش کامل ہونا ضروری ہے تا کہ انسان اس میں دلچسپی لے۔ یہ صفات خداوند تعالی میں ہیں جس کی جانب ہم سب رجوع کرتے ہیں اگرچہ نہیں جانتے کیا کر رہے ہیں۔ انسان اصل میں کامل سچائی اور حقیقت سے آشنا ہونا چاہتا ہے تا کہ ذات الہی میں محو ہو جائے۔ اصولی طور پر انسانی فطرت میں زندہ جاوید ہونا یا ہمیشہ زندہ رہنے کی لگن اس دنیا کے وجود کی علامت ہے جو ،ابدی ہے اور موت سے عاری ہے۔

اگر عالی جناب اس بارے میں تحقیق کرنا چاہیں تو حکم دیجیے کہ ان علوم کے ماہر مغربی فلسفہ کے مطالعے کے علاوہ فلسفہ مشاء پر فارابی اور بوعلی سینا رحمتہ اللہ علیہ کی کتابوں اور تحریروں کا مطالعہ کریں تا کہ ان پر واضح ہوجائے کہ جو بھی علم و دانش قانون علت و معلول پر مبنی ہے وہ عقلی ہے اور صرف حواس پر مبنی ہے اور عمومی قوانین اور عمومی مفاہیم کا ادراک جو ہر قسم کے مباحث کی بنیاد مانے جاتے ہیں، عقلی ہوتے ہیں اور محسوساتی نہیں۔ یہ ماہرین علوم سہروردی رحمتہ اللہ علیہ کی حکمت اشراق کے بارے میں کتابوں کا بھی مطالعہ کریں اور عالی جناب کو اس کی تفصیل پیش کریں کہ ہر مادی وجود اس نور کامل کا محتاج ہوتا ہے جو نور محسوسات سے پاک ہوتا ہے اور یہ کہ انسان کا اپنی ذات اور وجود کے بارے میں جو علم ہوتا ہے وہ محسوسات یا حواس خمسہ سے بالا تر ہے۔ اس سلسلے میں ماہر پروفیسروں سے کہئے کہ ماورائی فلسفے کو سمجھنے کے لئے صدر المتالہین (شیرازی رضوان اللہ تعالی علیہ و حشرہ اللہ مع النبیین و صالحین کی کتابوں سے رجوع فرمائیں تا کہ معلوم ہوجائے کہ علم کی حقیقت مادے سے بالا تر ہے اور ہر قسم کی سوچ بھی مادہ سے منزہ ہے اور مادی قوانین کے تابع نہیں ہے۔'' (۳)

ان خیالات کی روشنی میں نہ سہی لیکن تاریخی حوالوں کو درست رکھنے کے لیے علم ، مذہب اور تہذیب و تمدن کو تمام معلوم انسانی دور سے متعلق جاننے ہی میں عافیت ہے کہ تجرباتی علوم کے اس دور کے سائنس دان کائناتی قوت کے منکر نظر نہیں آتے تو نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کی صورت سامنے آتا ہے کہ انسانی فکر کے معلوم ادوار میں مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی فکر راسخ فکر کے بطور سامنے

آئی ہے اور اسی راسخ فکر کی بنیاد پر انسانی سماجیات اور اخلاقیات کے سلسلہ در سلسلہ معاملات وجود میں آئے۔یوں انسان استقرائیت سے استخراجیت اور استخراجیت سے استقرائیت کی انتہائوں کے درمیان ایک پینڈولم کی طرح گردش کرتا رہا ہے۔اسی پس منظر میں انسان کے علمی تضادات، مذہبی نزاعات اور تمدنی جدلیات کو دیکھنا چاہیے۔

کسی کا گریہ ضعف سے مبدل بہ دم سرد ہو یا نہ ہو۔کسی کو پانی کا ہوا ہونا باور آئے یا نہ آئے ہم اس بات کے منکر نہیں ہو سکتے کہ فطرت کے سائنسی اصول بر حق ہیں اورانسانی کسمپرسی اور ناپائیداری کی حقیقت کا ادراک مابعد الطبیعیاتی مناقشات کے در وا کرتا رہا ہے اور شاید کرتا رہے گا۔اور یہ کہ انسان نے فطرت کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایجادات کے سلسلے شروع کیے جو تا ہنوز جاری و ساری ہیں اور ان میں کمی آنے کی کوئی بھی وجہ موجود نہیں ہے۔لہٰذاکوئی مذہبی اپروچ کے تحت کسی کو نیچری کہے یا کوئی نیچری مذہبی مابعدالطبیعیات کے صدیوں سے راسخ سلسلوں کا منکر ہو جائے یا کوئی قصہ قدیم و جدید کے نزاعات میں پھنسا رہے اس بات کا احتمال ہرگز نہیں ہے کہ گردش ایام پیچھے کی جانب لوٹ جائے۔

سر سید احمد خان پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی تین حیثیتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے:

(۱)بطور مسلم مفکر(مذہب)

(۲) بطور علمی و سائنسی سکالر(سائنس)

(۳) بطور قومی و ملی رہنما(سوشیالوجی)

سر سید احمد خان کے علم کی مستقلیات کو کسی بھی انسانی علم کی مستقلیات کے بطور دیکھنا لازمی ہے یعنی مادی ارتقا کے مراحل میں علوم حالت استقلال میں نہیں رہتے۔چنانچہ سر سید خان کو بھی اگر تاریخی سیاق و سباق سے باہر نکل کر دیکھا جائے گا تو عمومی نعرہ بازی کی زد میں ان کے سر پر الزامات اور مطاعن کے کئی پہاڑ کھڑے کیے جا سکتے ہیں۔یعنی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے آبادیاتی دور میں مسلمانوں کے مقاصد کو سبوتاژ کیااور ان کی جنگ آزادی کو علمی طور پر تسلیم نہیں کیا۔اور یہ کہ ان کی مذہبی روشن خیالی نے صدیوں سے موجود بعض مسلم عقائد کی تنسیخ کا جتن کیا ہے۔اور

یہ کہ انہوں نے ایک ٹوڈی کے بطور عمل کرتے ہوئے ابن الوقتی کا رستہ اختیار کیا اور یوں مسلمانوں کو انگریزی استعماری سرکار سے مکمل تعاون کرنے پر آمادہ کیا۔

لیکن سر سید احمد خان پر الزامات و مطاعن کے سلسلہ در سلسلہ سلاسل پر آمنا و صدقنا کہہ کر کہ اب تیر کمان سے نکل چکا ہے اور پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے ہم ان کے منفی کردار کا رونا روتے رہیں یا انہیں کسی اور تناظر میں دیکھنے کا اہتمام کریں۔ظاہر ہے کہ یہاں تاریخی تجزیے کی ضرورت ہو گی۔ ممکن ہے کہ تاریخی تجزیہ یہ بتائے کہ سرسید کی مساعی کا اثبات ان کی عمومی نفی کے اندر سے برآمد ہوتا ہے۔

سر سید کے عہد میں سامنے آنے والے سائنسی دور نے ایک بار پھر انسانی نظر کو خوگر پیکر محسوس کر دیا تھا۔یوں ان دیکھے خدا کو منوانے کے لیے بہت سے سائنسی جوازات کی ضرورت تھی۔یہ جوازات سر سید احمد خان کے مقالات سے لے کر علامہ اقبال کے خطبات تک میں موجود ہیں۔یعنی اگر سر سید نے مسلم عقائد میں موجود بعض مرکزی نکات کی سائنسی توجیہات کی ہیں تو علامہ اقبال نے بھی کئی عقائد کی سائنسی تعبیر کی ہے۔ایسے میں کسی مجرد حقیقت مطلقہ کے منکرین کو دائرہ مذہب میں داخل ہونے پر آمادہ کرنے کے لیے استقرائی عقل کی ضرورت در پیش ہوئی۔اور اس عقل کا جواز یہ ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی کتاب میں خود اس بات کی شہادت موجود ہے کہ اب دانش زمینی حالات کے مطابق ہی وجود میں آئے گی کہ خدا نے انسانوں کے لیے اپنا آخری پیغام ارسال کر دیا ہے۔اس پیغام کی روشنی میں اس حقیقت کو ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اسلام میں اجتہاد کے دروازے بند نہیں کیے گئے۔یعنی اب انسان کو زمین کو اپنا مرکز نظر مان کر زمینی دانش سے بھی کام لینا ہو گا۔

خلیفہ عبد الحکیم کہتے ہیں:

"ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال اور انحطاط کی انتہا ۱۸۵۷ء میں ہوئی جب کہ ایک طرف فرنگی فاتحین اور دوسری طرف برادران وطن نے مسلمانوں کو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پیس ڈالنے کی کوشش کی۔مولانا حالی نے ''حیات جاوید'' میں لکھا ہے کہ اس زبوں حالی اور یاس انگیز کیفیت میں جب حالت یہ تھی کہ:

کوئی امید بر نہیں آتی　　　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

سید احمد خاں جیسے مرد عاقل و مجاہد کے دل میں بھی یہ خیال گزرا کہ اس وطن سے ہجرت کر کے کسی اسلامی ملک میں چلے جائیں جہاں مسلمانوں کا کچھ اقتدار و وقار موجود ہو اور عزت و آبرو سے زندگی کے باقی ایام گزر جائیں۔کچھ عرصے تک یہ خیال دل میں گردش کرتا رہا لیکن پھر ساداتی غیرت نے جوش مارا کہ ملت کو خراب حالت میں چھوڑ کر ذاتی آسائش اور عزت کے لیے ترک وطن کرنا ایک نہایت مذموم قسم کی ہجرت ہو گی۔ حمیت کا تقاضا یہی ہے کہ انہیں حالات میں پستی اور جہالت پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور جہاں تک ہو سکے اس قوم کو ذلت کے گڑھے میں سے نکالا جائے۔اس کے لیے غیر معمولی علمی اور عملی کوشش اور غیر معمولی جان نثاری کی ضرورت تھی۔ان حالات میں سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہوتی ہے کہ جس قوم کو آپ ابھارنا چاہتے ہیں وہی آپ کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔جہالت اور غلامی میں خیر و شر کے معیار الٹ جاتے ہیں۔بھلائی برائی معلوم ہوتی ہے اور برائی بھلائی۔چنانچہ سید صاحب کی مخالفت نہ انگریزوں نے کی اور نہ ملک کی غیر مسلم ملتوں نے۔زیادہ مخالفت علمائے جامد کی طرف سے ہوئی جنہیں نہ زوال ملت کے اسباب سمجھ میں آتے تھے اور نہ ان کا کوئی صحیح علاج سوجھ سکتا تھا۔وہ قدامت کو دین اور جدت کو بدعت سمجھتے تھے۔ وہ یہ نہ جان سکتے تھے کہ جو قوم غالب آ گئی ہے اس کے غلبے کے اسباب کیا ہیں۔یہ بات ان کے وہم میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ ان کے عقائد و اعمال اور ان کے نظریہ حیات میں کچھ خلل ہے۔سید کی کوششوں سے اقبال کے زمانے تک کچھ نہ کچھ بیداری قوم میں پیدا ہو چکی تھی"[۴]

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ زمین پر انسان کا کوئی بھی دور سائنسی سلاسل سے پاک نہیں ہے تاہم نشاۃالثانیہ کے بعد اس عمل میں جتنی تیزی آئی اس کی مثالیں تاریخ میں دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ اس امر پر توجہ بھی صرف کی جانی چاہیے کہ:

ڈاکٹر علی شریعتی کے نزدیک وہی تاریخ اصل تاریخ ہے جو ہمیں آنے والے کل کو سمجھنے میں مدد دے۔ماضی کے انسانوں کو سمجھنا در اصل اپنے آپ کو سمجھنے اور مستقبل کو سمجھنے کے برابر ہے۔ہر عہد میں عام انسانوں اور دانشوروں کے علاوہ کچھ نادر افراد بھی ہوتے ہیں جن کے خیالات اور عقائد دانشوروں اور تعلیم یافتہ لوگوں سے مختلف اور اختلافی صورت رکھتے ہیں۔یہ انسانیت کے عظیم منصف اور جینیئس ہوتے ہیں۔انہیں ہم دانشوروں کی صف میں شامل نہیں کر سکتے۔کیوں؟ اس لئے کہ وہ نئے

خیالات اور نئی فکر کو جنم دیتے ہیں جن سے دانشور ابھی تک آگاہ نہیں ہوتے اور نہ ہی اس فکر میں یقین رکھتے ہیں۔وہ ایسے خیالات کی ترویج کرتے ہیں جو بم کی طرح پھٹ اٹھتے ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جو نئے الفاظ اور خیال سے سوسائٹی میں جاری و ساری روح کی مخالفت کرتے ہیں اور اس عہد کی سائنس اور فہم و ذہانت کو رد کرتے ہیں۔اس طرح جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے۔

ہر عہد میں جینیئس اور بے مثال لوگ ہوتے ہیں ہمیں ان کی جستجو کرنا چاہئے۔کیونکہ یہ کسی سوسائٹی کے ارفع اور اعلیٰ افراد ہوتے ہیں۔یہ مستقبل کے تعلیمی ڈھانچے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ان لوگوں کا مطالعہ کرکے ہی ہم یہ پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ آئندہ زمانے کے تعلیم یافتہ لوگوں کی فکر کیا ہو گی۔ہمارے عہد میں جن لوگوں کی فکر اور گفتار دوسروں سے مختلف ہے ان میں رینے گینون کا ذکر ضروری ہے جو فرانس کا مشہو رجینیئس تھا۔الیکس کیرل جس کے شاہکار کو شہرت حاصل ہے۔اس کے علاوہ آئن سٹائن، ولیم جیمز اور باسلارڈ ہے جو فرانس کا مشہور مفکر اور سائنس دان تھا۔یہ سب لوگ ژاں پال سارتر اور برٹرینڈ رسل سے کہیں بڑے اور عظیم تھے۔اس کے علاوہ میکس پلانک۔گرویئل بیڑک پاسٹرنیک ہیں۔ان سب کو ہم صرف نئے تعلیم یافتہ لوگوں کا گروہ نہیں کہہ سکتے بلکہ انہیں اعلیٰ اور ارفع مقام دیتے ہیں کیونکہ ان سب نے سائنس کی پرستش کی مخالفت کی۔اس کے خلاف بولے اور آخری تین صدیوں کے پڑھے لکھے انسانوں کے مذہبی خیالات کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا۔

ان میں سے ہر شخص کا اپنا نظریہ تھا۔لیکن ان سب میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ تھی سائنس کی اندھی پرستش کی مخالفت جو آج کے دانشوروں کا مذہب ہے۔ان تمام لوگوں میں ایک جذبہ مذہبی حیثیت رکھتا ہے اور وہ ہے مذہبی جذبہ اور روحانی اعتقاد۔

سائنسی جنون کے علاوہ آج کل ایک نئی فکر جسے ہم انسانی فکر کی لہر کہہ سکتے ہیں دنیا میں پھیل رہی ہے۔ہم یہ بات بالکل نہیں کہہ سکتے کہ آئن سٹائن یا کیرل کے مذہب کا ضمیر ایک آدمی کے مذہب جیسا ہے۔یہ ایک دانشور کے مذہبی عقائد سے کہیں اعلیٰ اور سائنس سے کہیں بلند تر ہے۔

چنانچہ شریعتی کہتے ہیں کہ دو طرح کے مذہب دنیا میں موجود ہیں۔ایک مذہب ان کا ہے جن میں تعلیم اور سائنسی شعور کی کمی ہے یہ مذہب کی ایک سطحی اور پست شکل ہے۔ہم اور ذرا آگے بڑھیں تو ہم اپنے عہد کے سائنسی الحاد سے دوچار ہوجاتے ہیں جو ہمیں آج کی دنیا میں نظر آ رہا ہے۔یہ

لوگ تعلیم یافتہ لوگوں سے ارفع ہیں۔ یہ جدید دانشور ہیں۔ نئے جینیئس ہیں۔ شریعتی کہتے ہیں کہ جو ہم قرآن میں دیکھتے ہیں یا قرآن کا مطالعہ کر کے حاصل کرتے ہیں تو اچانک یہ الفاظ ہمیں میکس پلانک کیرل اور آئن سٹائن کے تراجم اور تحریروں میں ملتے ہیں۔ یہ سب کے سب لوگ اپنی ذات کے کرب اور ملحدانہ راستوں سے گزرے ہیں اور پھر انہوں نے اپنے آپ کو تلاش کیا ہے۔ اپنے آپ کو دریافت کیا ہے اور مذہب کو ڈھونڈھا ہے جو سائنس سے کہیں ارفع اور اعلیٰ ہے۔

یہ بات بلاشبہ کہی جاسکتی ہے کہ آج کا مذہب دراصل اس مذہب کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے جو حقیقتاً سائنس سے بہتر ہے اور یہی مذہب کی سچائی ہے۔ سائنس کی پرستش کے جنون کا عہد جو تعلیم یافتہ لوگوں کو مذہب سے اجنبی بنا دیتا تھا اب ختم ہو رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے ؟ اس لئے کہ آج کا جینیئس سائنس سے کہیں اعلیٰ ہے اور جو اس کائنات میں روح اور عقیدے کی موجودگی کا اعلان کرتا ہے اور انسانوں کے لئے مذہبی عقائد کی ضرورت کو اہم قرار دیتا ہے۔ اگر وہ میکس پلانک کی طرح فزکس کا آدمی ہے تو کیپلر کی طرح سوچے گا۔ کیپلر ایک عالم تھا جو کائنات کے مکمل نظام پر یقین رکھتا تھا اور کائنات کی تخلیق سے کلی طور پر باخبر تھا۔ کیپلر کائنات کا شعور رکھتا تھا اس لئے وہ جدید فزکس کا موجد بن گیا۔ اس ضمن میں آئن سٹائن کہتا ہے :" مذہبی احساسات اور عقیدہ تخلیق کا بہت بڑا راز ہے۔ اور سائنسی تحقیق میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔"(۵)

میکس کیرل جو چڑیوں کے دل کی تبدیلی پر دوبار نوبل انعام لے چکا ہے قطعی طور پر مذہبی آدمی نہ تھا کہتا ہے کہ عبادت سانس لینے اور کھانا کھانے کی طرح ضروری ہے۔ یہ انسانی جسم نفسیات ساخت کے لئے از حد لازمی ہے۔ اس کی رائے میں،روم کی بربادی اور تباہی کی اصل وجہ مذہب میں ان کے مضبوط اعتقاد کا فقدان تھا۔

اگر کسی سوسائٹی سے عبادت اور خالق حقیقی پر یقین کا جذبہ چھین لیا جائے تو یہ اس سوسائٹی کے لئے موت کا فرمان ہو گا یہ کیرل کے الفاظ ہیں جس کی فکر کا بقول لاروسی ڈسٹروفی بیسویں صدی کے انسانوں پر سب سے زیادہ اثر تھا۔(۶)

"کیا سترہویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کا تعلیم یافتہ طبقہ اس طرح بات کرتا ہے۔ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ اگر میں خدا کو دیکھ نہیں سکتا تو میں اس پر ایمان نہیں لاوں گا۔ لیکن آج گوریال کہتا ہے۔

انیسویں صدی میں سوشیالوجی نے ۱۹۸ قانون وضع کئے ہیں جن پراس علم کا اعتقاد ہے لیکن بیسویں صدی کی سوشیالوجی کسی قانون پر یقین نہیں رکھتی۔فرانس کا مشہور ریاضی دان شوارڈز کہتا ہے کہ ۱۹ ویں صدی کی فزکس کو یہ یقین تھا کہ وہ زندگی کے تمام مسائل کا حل پیش کر سکتی ہے ان مسائل میں شاعری بھی شامل تھی۔ لیکن آج فزکس کو یقین ہے کہ اسے یہ بھی نہیں پتہ کہ مادہ کیا ہے۔بیسویں صدی میں سائنس نے عجز کے ساتھ سر کیوں جھکا دیا ہے۔بقول گروچ سولہویں، سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی سائنس کا غرور کیوں ٹوٹ گیا ہے۔اس لئے کہ ایک نئے عہد کا آغاز ہو چکا ہے۔ ایک نیا نقطہ نظر عمل میں آ چکا ہے۔مستقبل کے تعلیم یافتہ گروہ نے آج کے تعلیم یافتہ گروہ پر اعتراضات شروع کر دیے ہیں۔مستقبل میں مذہبی نظریہ اور مذہبی فکر رائج ہو گی۔ایسا مذہبی نظریہ اور مذہبی فکر جو سائنس سے کم نہیں بلکہ سائنس سے اعلیٰ اور ارفع ہو گی۔امام خمینی اور گوربا چوف کے درمیان ہونے والی بات چیت انسانیت کے دو عظیم جینیئس کی بات چیت ہے۔اس بات چیت کو میٹا مذہبی اور میٹاسائنسی سطح پر سمجھا جا سکتا ہے۔دونوں انسانوں نے زندگی کے نئے مفہوم اور انسانیت کی منزل کی ضرورت محسوس کی ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔دنیا کو بنی نوع انسان کے لئے۔ آزادی مساوات انسانیت دلانے کے لئے اٹھانا ہو گا۔اس عہد میں پیدا ہونے والی یہ سوچ ۲۱ ویں صدی میں اپنی منزل کو پاسکتی ہے اور بنی نوع انسان کا ورثہ بن سکتی ہے۔''(۷)

اس طویل اقتباس کی روشنی میں اگر ہم سر سید احمد خان کے ان نظریات کی جانب رجوع کریں گے کہ جن کا مقصد اپنے ارد گرد کے انسانوں کی درست جہت نمائی کرنا تھا تو ہمیں معلوم ہو گا کہ انہوں نے لارڈ میکالے کی دی ہوئی تعلیمی پالیسی کی نزاکتوں کو سمجھ کر اپنا لائحہ عمل مرتب کیا تھا۔لارڈ میکالے کی پالیسی کا لب لباب یہ تھا کہ ہندوستانی ذہنوں کو ایسی تشکیک کا نشانہ بنایا جائے جس کے نتیجے میں وہ اپنے اپنے مسالک و مذاہب پر حرف زنی کریں اور یوں اس عمل میں پیدا ہونے والے اس نئے فکری خلا کو فاتحین کے مذہب و مسالک سے پُر کرنے کی کوششیں کی جائیں۔سر سید احمد خان نے اپنی دانشوری کے مختلف سلاسل کو اپنے عقلی تصورات کی مدد سے فروغ بخشا۔انہوں نے جن تین بڑے محاذوں پر مسلمانان ہند کا دفاع کیا،وہ تھے :

(۱) برطانوی سیاسی یلغار کا محاذ (۲)سائنس اور مذہب کا محاذ (۳)مسلمانوں کی عزت نفس کی بحالی کا محاذ۔

انہی تینوں محاذوں پر آگے چل کر علامہ محمد اقبال نے اپنی فکری جدلیات کو استعمال کیا۔وہ اپنے دوسرے خطبہ "مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار۔

"The Philosophical Test of the Revelations of Religious Experecience"

میں لکھتے ہیں " حقیقت مطلقہ ایک بے بصر محرک حیات نہیں جو غور و فکر سے قطعاً غیر منور ہو بلکہ اس کی ماہیت سر تا سر غائی ہے۔" [۸]

وہ پانچویں خطبہ "اسلامی ثقافت کی روح(Spirit of Isamic Culture) میں زیادہ تفصیل کے ساتھ الجاحظ، اخوان الصفاء اور ابن مسکویہ کے نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی فکری تاریخ میں نظریہ ارتقاء پر غور و فکر کا ایک طویل سلسلہ موجود ہے جس سے عام حلقوں میں پائی جانے والی اس غلط فہمی کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے کہ تصور ارتقاء موجودہ سائنس کا کوئی نظریہ یا علمی انکشاف ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تصور ارتقا قرآنی تعلیمات کے منافی نہیں ہے۔اقبال اس موقف کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ جاحظ تھا، جس نے سب سے پہلے ان تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا جو نقل مکانی کے نتیجے میں جانوروں میں رونما ہو جاتی ہیں۔[۹]۔اس حوالے سے ابن مسکویہ نے اپنی تصنیف "الفوزلاصغر" میں تصور ارتقا کی تشکیل کی۔اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان کس طرح سائنسی افکار کا احاطہ کر رہے تھے

"اقبال اپنے ساتویں خطبہ "کیا مذہب کا امکان ہے؟"میں رقمطراز ہیں:

اجمالاً پوچھیے تو مذہبی زندگی کی تقسیم تین ادوار میں ہو جاتی ہے جن میں ہر دور کو ایمان، فکر اور معرفت کے ادوارسے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔پہلا دور ایمان کا ہے، دوسرا فکر ، تیسرا عرفان حقیقت کا۔دور اول کی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس میں مذہب کا ظہور ایک ایسے نظم و ضبط کی شکل میں ہوتا ہے جسے افراد ہوں، یا اقوام ایک حکم کے طور پر اور اس لیے بے چون و چرا قبول کر لیتے ہیں، انہیں اس امر سے بحث نہیں ہوتی کہ اس نظم و ضبط کی حکمت از روئے عقل و فکر کیا ہے اور کیا۔سیاسی اور ملی

اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ طرز عمل قوموں کی تاریخ میں بڑے بڑے دور رس اور وقیع نتائج کا باعث ہوتا ہے لیکن جہاں تک افراد کے اندرونی نشوونما اور وسعت ذات کا تعلق اس سے اس پر کوئی خاص اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ نظم و ضبط کی پوری پوری اطاعت کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب لوگ عقلاً اس پر غور کرنے اور سمجھنا چاہتے ہیں کہ اس کا حقیقی سر چشمہ کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مذہب کو کسی ایسی مابعدالطبیعیات کی جستجو رہتی ہے جو اس کے لیے ایک اساس کا کام دے سکے۔یعنی منطقی اعتبار سے کائنات کے کسی ایسے نظریے کی جو تضاد و تناقض سے پاک ہو اور جس میں خدا کے لیے بھی کوئی جگہ ہو۔لیکن تیسرا دور آتا ہے تو ما بعدالطبیعیات کی جگہ نفسیات کے لیے خالی ہو جاتی ہے اور انسان کو یہ آرزو ہوتی ہے کہ حقیقت مطلقہ سے براہ راست اتحاد و اتصال پیدا کرے چناں چہ یہی مرحلہ ہے جس میں مذہب کا معاملہ زندگی اور طاقت و قدرت کا معاملہ بن جاتا ہے اور جس میں انسان کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو تی ہے کہ ایک آزاد اور با اختیار شخصیت حاصل کر لے شریعت کے حدود و قیود توڑ کر نہیں بلکہ خود اپنے اعماق شعور میں اس کے مشاہدے سے۔(۱۰)

علامہ اقبال اپنے خطبہ (Principle of Movement in the Structure of Islam) میں یہ بھی لکھتے ہیں:

دراصل یہ صرف ترک ہیں جو امم اسلامیہ میں قدامت پرستی کے خواب سے بیدار ہو کر شعور ذات کی نعمت حاصل کر چکے ہیں۔یہ صرف ترک ہیں جنہوں نے ذہنی آزادی کا حق طلب کیا ہے اور جو ایک خیالی دنیا سے نکل کر اب عالم حقیقت میں آ گئے ہیں۔"(۱۱)

ہمیں چاہئے آج اپنے اس موقف کو سمجھیں اور اپنی حیات اجتماعیہ کی از سرِ نو تشکیل اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں کریں، تا آنکہ اس کی وہ غرض و غایت جو ابھی تک صرف جزواً ہمارے سامنے آئی ہے ، یعنی اس روحانی جمہوریت کی نشوونما جو اس کا مقصودو منتہائے، تکمیل کو پہنچ سکے۔"(۱۲)

سر سید احمد خان چاہتے تھے کہ مسلمان از سر نو اپنا سیاسی وقار حاصل کریں۔اس منزل کے حصول کے لیے اس جدید علم کی تحصیل ضروری تھی جس کی بنیاد پر سیاسی، سائنسی، تکنیکی اور علمی میدانوں سے استفادہ کرتے ہوئے ہندوستان کے مسلمان سوسائٹی میں سرخرو ہو پائیں۔چنانچہ انہوں نے

شدید مخالفت کے باوجود انگریزی علوم کے اکتساب پر مسلمانوں کو آمادہ کیا۔اس حوالے سے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان عقلی بنیادوں پر مذہب کی تفہیم کریں تا کہ سائنسی علوم کی تحصیل کے بعد بھی روحانی یا مابعد الطبیعیاتی معاملات سے ان کی مانوسیت قائم رہے۔یوں وہ اپنے مقرر کردہ اہداف کے مطابق برطانوی سیاسی بالا دستی کے دور میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے تبحر علمی کی مدد سے کم از کم علمی میدانوں میں مسلم شناخت اور عظمت ماضی کے حوالوں کا خوش اسلوبی سے احیا کر پائے۔انہوں نے سائنس کے ہاتھوں مذہب کی شکست کی صورت حال کو بھانپ کر روشن خیالی پر مبنی مذہبی تعبیرات کو فروغ بخشا۔ سر سید احمد خان کے مقالات میں جس نوع کی عقلی منطق استعمال ہوئی ہے اس کے نتیجے میں ایسی آزادیِ رائے کے در وا ہو سکے کہ جنہیں سامراجی برہمنی اتحاد بھی بند نہ کر سکا اور یوں سر سید احمد نے مستقبل بینی کرتے ہوئے یہ نعرہ بلند کر دیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا علیحدہ تشخص قائم رکھنے کے لیے علیحدہ مملکت کی ضرورت بھی پیش آ سکتی ہے۔اس تشخص کو علامہ اقبال اور قائد اعظم نے بھی اپنا آئیڈیل بنایا اور یوں وہ سر سید کی تمنائوں کے مطابق مسلمانوں کی عزت نفس کی بحالی کے محاذ پر کامیاب و کامران ہوئے۔

عصری جدیدیت کو یورپی نشاۃ الثانیہ کا عطیہ یا شاخسانہ قرار دے کر دانشوروں نے اپنی اپنی مطلب بر اری کے لیے کئی نظری کتب اور مقالے تحریر کیے ہیں۔ان کا سرسری مطالعہ قاری کو اس نتیجے پر پہنچاتا نظر آتا ہے کہ کئی علاقوں خاص طور پر بر صغیر پاک و ہند میں تو شاید دانش سرے ہی سے مفقود تھی۔بایں ہمہ اس علاقے کی سیاسی، سماجی، معاشی، علمی اور فنی جمع پونجیاں اس عہد کے دیگر علاقوں کی جمع پونجیوں سے کم نہیں تھیں۔امور سلطنت چلانے کے لیے لکھے جانے والے سیاست ناموں سے لے کر ،مذہبی اور صوفیانہ دانش تک، کھیتی باڑی سے لے کر عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر میں کام آنے والی فنی اور عملی مہارتوں تک، عسکری سازو سامان کی پیداوار سے لے کر فنون حرب کی بوقلمونیوں تک، سنسکرت،ہندی، عربی، فارسی اور کئی دیگر السنہ میں دی جانے والی ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ فلسفیانہ فکر تک،انسان سازی کی بنیادی اخلاقیات سے لے کر بلند پایہ روحانی دانش تک اپنے زمانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے سب کچھ تو موجود تھا۔مزید بر آں شعر و ادب کے رنگا رنگ ذخائر اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس علاقے کے مقامی باشندے اپنی ضروریات پوری کر رہے تھے۔فلکیات،سماجیات،

معاشیات، تہذیبیات، سیاسیات، ریاضیات، فکریات اور فنونیات تک بر صغیر کے عوام کی زندگیوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالے ہوئے تھے۔نئی بستیاں اور شہر بس رہے تھے ، آمدو رفت اور رسل و رسائل کے پرانے طور طریقے عملی احتیاجات کو پورا کرنے کے قابل تھے۔یہ فنون حرب اور حکمت عملی کی دانش ہی کا نتیجہ تھا کہ ۱۷۰۷ء تک پورا ہندوستان سلطنت مغلیہ کا حصہ بن چکا تھا۔بدھ حکمران اشوک کے بعد یہ مغل تھے کہ جو اکھنڈ ہندوستان بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ان کی زیر نگرانی ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مسالک کی آزادانہ ترویج کے سلسلے جاری و ساری تھے۔

سر سید احمد کی کتابوں اور ان کے طرز بیان سے جن امور کا سیکھنا لازم ہے وہ یہ ہیں کہ انسان کو زمانے کی رفتار کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے نظریات اور خیالات میں بے دریغ تبدیلیاں پیدا کرنے کے عمل میں مصروف رہنا چاہیے،کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ایٹمی دور کا انسان پرانے معاشروں کے سست رفتار اور انقلاب نا آشنا انسانوں کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا۔عملی طور پر ایسا تبھی ممکن ہو گا کہ وہ دنیا کو اپنے تعصبات کی عینک سے نہ دیکھے۔اور جہاں وہ بطور مسلمان تمام مومن بھائی بھائی ہیں کے مقولے کی بابت سنجیدہ ہے اتنا ہی اسے اپنے ارد گرد بستے دوسرے مذاہب اور عقیدوں کے لوگوں کو محبت اور بھائی چارے کا پیغام دینا چاہیے۔اس عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اسے بنی نوع انسان کا احترام کرنا ہو گا۔علاوہ ازیں اسے ہر طرح کے لسانی، مقامی، خاندانی اور انسانوں کو نقصان پہچانے والے سماجی، عمرانی اور ثقافتی تصورات سے باہر آ کر ایک روشن فکر انسان کی زندگی اور رجحانات کا مقلد ہونا چاہئے۔

سر سید احمد خان کی تاریخی، علمی، ادبی، مذہبی، عمرانی اور ثقافتی تحریروںکے مطالعے سے انسان اور انسانیت کے حوالے سے ایسے خوشگوار خیالات کا احساس ہوتا ہے کہ لگتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی خیالات کو بھی عقلی حوالوں سے پرکھتے ہوئے ہر نوع کے تعصبات سے بالاتر ہو کر مسائل و معاملات کو سمجھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔وہ اگر ہندوستان کی قدیم تاریخ کو زیر بحث لاتے ہیں۔راجائوں مہاراجوں کے ادوار کی تصویر کشیاں کرتے ہیں۔دہلی کی آثار قدیمہ پر لکھتے ہیں، مغلوں کی تاریخ رقم کرتے ہیں، مسلمانوں میں موجود معتزلی اورشاعری خیالات کا جائزہ لیتے ہیں،بدعتوں کے رد کی بات کرتے ہیں۔تصوف کے سلاسل کو سامنے لاتے ہیں، اخلاق انسانی اور فضائل انسانی کا سبق دیتے ہیں، مسلمانوں

کو انگریزوں کے جبر سے بچانے کے لیے مختلف رسائل طبع کرواتے ہیں، دیگر مذاہب عیسائیت، یہودیت وغیرہ پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔پیغمبر اسلام ﷺ کے حوالے سے غیر مذاہب کے لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کا نازک کام کرتے ہیں ان کی سیکولر اور روشن خیال فکر ان کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔اسلامی تلمیحات، قصص قرآنی پر ان کی تحریریں عقلی مواد سے مالا مال ہیں۔اسی طرح مذہبی صحیفوں کے ضمن میں ان کی تفسیروں میں منطق اور عقل کا سلسلہ اپنا رنگ دکھاتا ہے۔سر سید احمد خان نے سائنس کے حوالے سے علم ہندسہ،فزکس وغیرہ کے معاملات پر اس عہد تک کی معلومات سے بھر پور استفادہ کیا ہے۔ان کا خیال تھا کہ سائنسی ترقی کسی قوم کو عروج پر پہنچانے کا کام کر سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔مرزاغالب، دیوان غالب، ردیف الف

۲۔الف۔د۔نسیم ، اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر، مقالہ پی ایچ۔ڈی مملوکہسعادت سعید،لاہور، تمہیدی مباحث، ۱۹۵۸ء ،ص۷

۳۔علامہ محمد اقبال، پس چہ باید کرد ، اے اقوام شرق، ترجمہ،سعادت سعید، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ،اشاعت دوم، ۲۰۱۵ء ،آغا شوکت علی، حرف اول،ص۳

۴۔خلیفہ عبد الحکیم، فکر اقبال،لاہور، اقبال اکادمی، (آٹھواں ایڈیشن)ص ۱۷۰۔۱۷۱،

۵۔علامہ محمد اقبال، پس چہ باید کرد ، اے اقوام شرق، ترجمہ،سعادت سعید، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ،اشاعت دوم، ۲۰۱۵ء ،آغا شوکت علی، حرف اول،ص۳

۶۔ایضاً

۷۔ایضاً

۸۔۔تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ،(ترجمہ)، سید نذیر نیازی، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۵۸ئ، ص۸۲،۸۳

اس حوالے کا اصل متن یہ ہے:

On the analogy of our conscious experience, therefore, Reality is not a blind vital impulse wholly unilluminated by idea. Its nature is through and through teleological.

۹۔ایضاً۔ص ۲۰۵، ۲۰۶

اس حوالے کا اصل متن یہ ہے:

It was Jahiz who was the first to note the changes in bird-life caused by migrations. Later Ibn Maskawaih who was a contemporary of Al-Beruni gave it the shape of a more definite theory, and adopted it in his theological work Al-Fauz al-Asghar. I reproduce here the substance of his evolutionary hypothesis, not because of its scientific value, but because of the light which it throws on the direction in which Muslim thought was moving.

۱۰۔ایضاً،ص۲۷۸، ۲۷۹

اس حوالے کا اصل متن یہ ہے:

Broadly speaking religious life may be divided into three periods. These may be described as the periods of "Faith", "Thought", and "Discovery." In the first period religious life appears as a form of discipline which the individual or a whole people must accept as an unconditional command without any rational understanding of the ultimate meaning and purpose of that command. This attitude may be of great consequence in the social and political history of a people, but is not of much consequence in so far as the individual's inner growth and expansion are concerned. Perfect submission to discipline is followed by a rational understanding of the discipline and the ultimate source of its authority. In this period religious life seeks its foundation in a kind of metaphysics- a logically consistent view of the world with God as a part of that view. In the third period metaphysics is displaced by psychology, and religious life develops the ambition to come into direct contact with the

Ultimate Reality. It is here that religion becomes a matter of personal assimilation of life and power; and the individual achieves a free personality, not by releasing himself from the fetters of the law, but by discovering the ultimate source of the law within the depths of his own consciousness

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۵۰

اس حوالے کا اصل متن یہ ہے:

The truth is that among the Muslim nations of today, Turkey alone has shaken off its dogmatic slumber, and attained to self-consciousness. She alone has claimed her right of intellectual freedom; she alone has passed from the ideal to the real- a transition which entails keen intellectual and moral struggle.

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۷۷

اس حوالے کا اصل متن یہ ہے:

Let the Muslim of today appreciate his position, reconstruct his social life in the light of ultimate principles, and evolve, out of the hitherto partially revealed purpose of Islam, that spiritual democracy which is the ultimate aim of Islam.